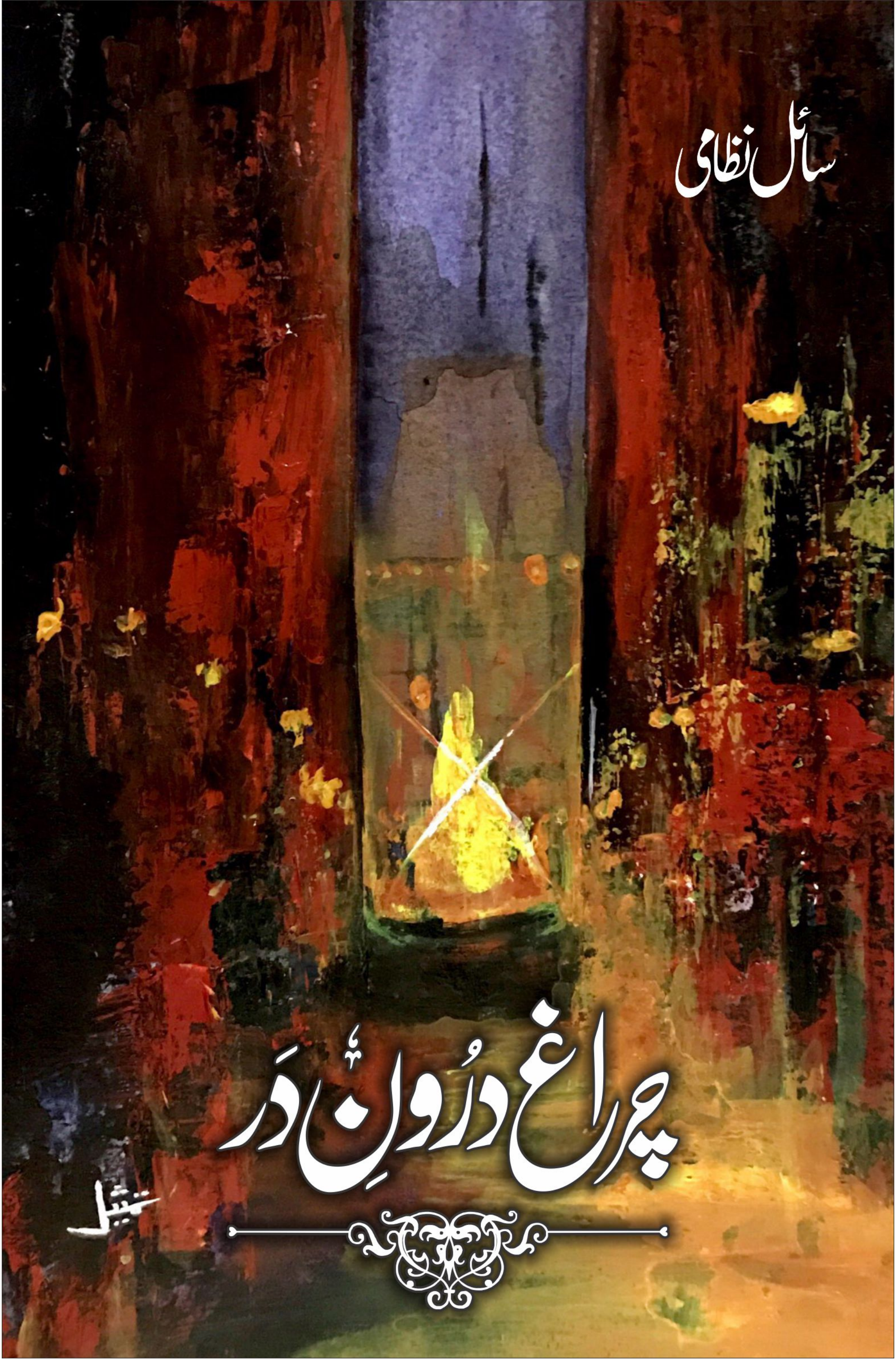
سائل نظامی



چراغ درُونِ دَر

زیرِ نظر شعری مجموعہ کے خالق سائل نظامی کو مَیں نے جب پہلی دفعہ گوشۂ ادب اسلام آباد کی ماہانہ شعری نشست میں سُنا تو اِس نوجوان کی غزل کے بارے میں میرا اشتیاق بڑھا۔ وہ اِس لیے کہ اِتنی کم عمری میں کسی نوجوان شاعر کے شعر اور مزاج میں یہ پختگی بہت کم دیکھنے میں ملتی ہے۔ سائل کے ہاں یہ رویّہ غالباً اس کی اردو شاعری کی کلاسیکی روایت اور اپنی اعلیٰ تہذیبی اقدار سے وابستگی کی خواہش ہے۔ جس نے اس کی ادبی اور علمی زندگی کو کہیں بھی غیر متوازن نہیں ہونے دیا۔

اردو غزل سائل کی اوّلین ترجیح ہے اور اسی صنف میں وہ اپنا ادبی قد کاٹھ تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ چراغِ درونِ در پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ سائل کا ایک منفرد شعری و جمالیاتی عقیدہ ہے۔ جس میں رمزیّت اور اسراریت کا کردار نمایاں ہے۔ سائل کی شخصیّت میں مجھے ایک نوجوان ماڈرن صوفی کی جھلک نظر آتی ہے جو اپنے مذہبی اور تہذیبی عقائد کے ساتھ اپنی عملی زندگی میں بھی تازہ دم ہے۔

شاعری میں سائل نے ایک درکار لسانی آگاہی اور لفظوں کی خوش آہنگ ترتیب سے اپنے رُوحانی کرب اور اندرونی پیاس کو جس ہنرمندی سے اشعار میں ڈھالا ہے وہ قابلِ تحسین و توجہ ہے۔ سائل کے ہاں جذب و سکوں اور تازگی کی جو فضا ہے وہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور کسی بھی اچھی شاعری میں اس فضا کا ہونا ایک ضروری امر ہے۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ سائل کا آیندہ شعری مجموعہ اس کے مستقبل کے ادبی سفر میں ایک اہم قدم ہو گا۔

حلیم قریشی، اسلام آباد
۲۱ جون ۲۰۱۹

محبت اور عرفان کی روشنی

چراغِ دُرونِ در زاویۂ دید کی ترجیحی دُروں بینی کی طرف اشارہ نُمائی تو کرتا ہی ہے، داخل کی جگمگاہٹ کی ضرورت و اہمیّت کی طرف بھی عنانِ توجہ منعطف کرتا ہے جو بد نصیبی سے عمومی توجّہات کے مرکز سے سرکتے سرکتے صفِ نعال تک پہنچی ہے اور ہمارے دائرۂ طلب سے اس کے دایمی اخراج میں زیادہ وقت نہیں بچا ہے۔ ایسی تنگ نائے تیرگی میں کسی حجرۂ باطن میں لَو دیتے اکلوتے چراغ کی بہ ظاہر محدود سی تابانی بھی کچھ کم منزلت نہیں رکھتی کہ روشنی کی اِس ننھی سی کونپل میں بھی ایک سدا بہار شاخسارِ نُور کا امکان تو بہ ہر حال پنہاں ہے۔

سائل نظامی کی یہ شوق انگیز غزلیں اپنے خمیر میں، باطن کے جھروکوں میں فروزاں کچھ ایسی ہی عُود نہاد اور عنبر سرشت شمعیں ہیں جن کی اخلاص و گداز میں نتھری ہوئی روشنی ہمارے ظاہر کو بھی پرتوِ تجلّی سے سرشار کرتی ہے۔ حیات و کائنات کو محبّت و عرفان کی چلمنوں کی اوٹ سے دیکھتا ہوا یہ نوجوان شاعر اساسی طور پر داخل سے پھُوٹتی ہوئی ایک توانا صدائے نَے ہے۔ جس میں خارج کے مسائل و آلام کی صدائے بازگشت بھی شامل ہو گئی ہے۔ یہ بھی ہے کہ یہ صدائے کرب شدید تُند و تلخ نہیں، معتدل اور عمیق ہے۔

شعر و عرفان کی توانا ٹہنی پر چشتی نظامی ذوقیات کے گلاب چٹکیں تو وہی رنگ جمتے ہیں، جن کی چند دل نشین جھلکیاں ہمیں چراغِ دُرونِ در میں دِکھائی دیتی ہیں۔ شاعر بارہا دیکھے ہوئے منظروں کو بالکل مختلف زاویے سے دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اِن منظروں سے اوّلیں مرحلۂ تعارف میں بہے چلے جاتے ہیں۔ سائل نے لفظ و معنی کے معاملے میں بھی خاصی حد تک یہی اجتہادی طریق اختیار کیا ہے اور خوش صوت تراکیب کی تازہ کاری سے ہنرمندی کا عمدہ مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں کامیابی یہ ہے کہ اس نے غزل کے مطلوب و مقصود لہجے پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا اور جدّت طرازی کا جوش یا ذہنی و جذباتی ہیجانات کا خروش اس کی پہلی اور آخری شناخت نہیں بنا۔

معین نظامی، لاہور
۱۷ اکتوبر ۲۰۱۹

چراغ درونِ در

سائل نظامی

قلم دوست مطبوعات
۱۴۳۹

۸۹۱_۴۳۹۱

ن ظ ام ی، نظامی، سائل (پ: بدھ، ۱۷ جولائی ۱۹۹۱ء، ۵ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ)
چراغ درونِ در/ سائل نظامی
گوجرخان: قلم دوست مطبوعات، نومبر ۲۰۱۹ء، ۱۳۶ صفحات
۱-اردو ادب ۲-شاعری
۳-پنجاب-گوجرخان
آئی۔ایس۔بی۔این: 978-969-7829-04-0

سلسلۂ اشاعت (۶)

CHIRAAGH DUROON-E-DAR/
SAAIL NIZAMI_.GUJAR KHAN: QALAM DOST PUBLICATIONS,
NOVEMBER-2019,PP136,SERIES OF PUBLICATION(6)
ISBN:987-969-7829-04-0

نمونہ خوانی: حسن نواز شاہ/ نڑالی
نظرِ ثانی: رحمان حفیظ/ اسلام آباد
مصوّری سرورق: تمثیل حفصہ/ کوئٹہ
طبعِ اوّل: نومبر ۲۰۱۹ء
تعداد: ۵۰۰
ناشر: قلم دوست مطبوعات، گوجرخان
قیمت: ۳۰۰ روپے

دست یابی کا پتا:
میلاد چوک، وارڈ نمبر ۷، حیات سرروڈ، گوجرخان شہر، ضلع: راولپنڈی
صوتی رابطہ: ۰۳۰۰۔۹۸۳۳۳۳۴
برقی پتا: saail.nizami@gmail.com

انتساب

باباجی منیر سیفی

اور

حضرتِ خالد احمد

کے نام

ع : اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

بجَتی ہُوئی مٹی سے قدم مَیں نے نکالا
اور ’’کون‘‘ کی دہلیز پہ اِک شور اُٹھا : کون؟

خورشیدؔ رضوی

سِلکِ دُرَر

عقیدت

آشوب

غزلیات

۔۔۔جو بھی ہے

فارسی کا ایک شعر ہے :

بوالہوس! عشق مکن اے دلِ نا صبر و قرار
عاشقی فنِ شریف است ولے کارِ تو نیست

میرے نزدیک عاشقی اور شاعری بنیادی طور پہ باہم مماثل ہیں۔ لہٰذا مذکورہ شعر کو مَیں تھوڑے تصرّف کے ساتھ یوں کہنے کی جسارت کروں گا :

بوالہوس! شعر مگو اے دلِ نا صبر و قرار
شاعری فنِ شریف است ولے کارِ تو نیست

مجھے خودستائی کی کوئی لَت نہیں، لیکن تحدیثِ نعمت کے طور پہ عرض کروں تو بہت سے معاشرتی معاملات کے اندر مَیں بے وقوفی کی حد تک شریف واقع ہوا ہوں، شاید یہی سبب تھا کہ شاعری نے

مجھے آ لیا۔ ابتداءً مَیں اسے وقتی اُبال سمجھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اُبال میرے لیے وَبال بن گیا۔ میری خوش قسمتی کہ اِس وَبال میں مجھے چَین آنے لگا اور آج مَیں اپنے اس وبال مع چَین کے پہلے مجموعے کو آپ سے ساجھا کر رہا ہوں۔

شاعری کا آغاز ۲۰۰۴ میں کیا، یعنی یہ مجموعہ میری ۱۵ سال کی محنت ہے۔ شاید ابھی اور وقت لگاتا، لیکن مجھے اپنے اندر کے نقاد سے ڈر لگنے لگا۔ غزل جُوں جُوں کہنہ ہوتی، مجھے فضول محسوس ہونے لگتی۔ جس کی وجہ سے خاصی غزلیات تلف کر دیں۔ اپنی شاعری کے مزید نقصان سے بچنے کے لیے یہ مجموعہ شائع کروا رہا ہوں تاکہ جو بھی اور جیسا بھی کہا ہے اس کی تحفیظ ممکن ہو سکے۔ اس مجموعے میں میری ابتدائی شاعری سے چند ایک چیزیں ہی باقی رہ گئیں جنھیں اس کتاب کے آخر میں زمانی ترتیب سے شامل کیا ہے۔ نظمیں بہت کم کہی ہیں، شاید طبیعت کا رجحان نظم کی طرف شروع ہی سے زیادہ نہیں ہُوا۔ ان چند نظموں میں سے ایک نظم، جو ۲۰۱۷ میں سفرِ اجمیر شریف سے واپسی پہ کہی گئی، ''عقیدت'' کے باب میں اور ''آشوب'' کے باب میں سانحۂ آرمی پبلک سکول پشاور کے حوالے سے کہی گئی ۳ نظمیں بھی شاملِ مجموعہ ہیں۔

شاعری کے حوالے سے بس اتنا کہوں گا کہ شاعری میرے نزدیک سلیقے سے کہی ہوئی بات کا نام ہے۔ مجھے وہی شعر اچھا لگتا ہے جو سلیقے سے کہا گیا ہو، میرے مطابق بڑے شعر کے لیے بڑا مضمون ضروری نہیں، فقط بہترین سلیقہ لازم ہے۔ آپ کو بہر حال اختلاف کا

حق ہے کیوں کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔

کتاب پڑھتے ہوئے بعض مقامات پر آپ کو علاقائی زبانوں کے کچھ الفاظ، محاورے یا روزمرّہ بھی ملیں گے۔ میرے نزدیک زبان کو وسعت دینے کا سب سے مہذّب طریقہ یہی ہے کہ ہم مزاج زبانوں کے الفاظ درآمد کیے جائیں جن سے نامانوسیت کی بُو بھی نہ آئے اور شعر میں ''پیوند'' بھی محسوس نہ ہوں۔

ہر کھرا تخلیق کار نہ صرف اپنے عہد کی آنکھ ہوتا ہے بلکہ وہ اس عصر کی زبان بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں وقوع پذیر ہونے والے معاملات، حادثات اور مسائل سے چشم پوشی نہیں کر پاتا۔ اس کے مشرب میں چشم پوشی کرنا یا مسائل سے دامن بچانا کسی صورت روا نہیں ہو سکتا۔ سچی شاعری بھی اپنے عصر کی غمّاض ہوتی ہے اور آواز بھی۔ ایسے ہی شعر کو گونگے بہروں کی آواز ہونا چاہیے اور شنوائی بھی۔ میرے شعروں میں بھی اس طرح کے کچھ نمونے آپ کو مل جائیں گے۔ یہ اشعار نہ صرف میرے جذبات و احساسات بلکہ میرے عصر کے بھی آئینہ دار ہیں۔ مَیں نے جو دیکھا، محسوس کیا اور سمجھا اُنھیں شعروں کے پیکر میں ڈھال دیا۔ یہ کچّے پکّے احساسات خالص میرا اپنا مشاہدہ اور تدبّر کا نتیجہ ہیں۔ مَیں نے کوشش کی ہے کہ اِس حوالے سے سکّہ رائج الوقت سے ممکنہ حد تک اجتناب برتُوں، محض نعرے بازی سے دامن کَش رہتے ہوئے وہی کہوں جو مَیں نے دیکھا اور محسوس کیا۔ میرا یہ بھی ماننا ہے کہ انسانی رویّوں اور رجحانات کی تشکیل میں ادب کا بھی نہایت اہم کردار رہا ہے۔ شعر کہتے ہوئے مَیں نے اِس امرِ لازم

کو بھی ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ سچّا ادب اپنے عصر میں بلکہ دیگر زمانوں میں بھی رجحان ساز رہا ہے۔

آخر میں ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا مجھ پہ واجب آتا ہے، جنھوں نے ہمیشہ مجھے اپنی شفقتوں، محبتوں اور مخلصانہ داد و تنقید سے نوازا۔ خصوصاً میرے اہلِ خانہ کا شکریہ، جنھوں نے مجھے ایسا ماحول فراہم کیا جس کے نتیجے میں ابتدا ہی سے مَیں نے کتاب اور لفظ کو دوست بنایا۔ مَیں اس موقع پر اپنی امّی جی کا ذکر کبھی مؤخر نہیں کر سکتا، جو اِس کتاب کی اشاعت سے تین سال قبل ہمارے گھر کو وِیران کر کے اپنے ابدی گھر چلی گئیں، اگر آج وہ ہمارے درمیان ہوتیں تو یقیناً میری کتاب کی سب سے زیادہ خوشی اُنھیں ہوتی، بہرحال جنابِ انجم خلیق کے اِس شعر پہ میرا کامل ایمان ہے:

مَیں اب بھی اُس کی دعاؤں میں سانس لیتا ہوں
یہاں سے جا کے بھی ماں کارساز کتنی ہے!

اِس کے بعد مجھے دست بستہ شکریہ ادا کرنا ہے اپنے اساتذۂ کرام کا، جنھوں نے شاعری کے جان کاہ کارزار میں ہمہ وقت میری رہنمائی کی۔ قبلہ پیر سیّد انوار الحسن کاشفؔ گیلانی، جناب ڈاکٹر عبد العزیز ساحرؔ، جنابِ رحمان حفیظؔ اور لالہ حسنؔ نواز شاہ ہی وہ ہستیاں ہیں، جنھوں نے مجھے شعر کہنے سے لے کر شعر سجانے تک کے مرحلے طے کروائے۔ آج مَیں ادبی حوالے سے جو کچھ بھی ہوں، انھی اساتذہ کی بہ دولت ہوں اور مجھے اِس کے اعتراف میں ہمیشہ طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ رحمان حفیظ صاحب نے اپنی بے تحاشا مصروفیات میں سے وقت نکال کر

نہایت توجّہ اور محبّت کے ساتھ اس مجموعہ پر نظرِ ثانی بھی فرمائی جو اُن کی اعلیٰ ظرفی اور اپنے چھوٹوں سے محبّت کا بیّن ثبوت ہے۔ حسن لالہ کا اس حوالے سے بھی خصوصی شکریہ مجھ پہ واجب ہے کہ اُنھوں نے میری شاعری پر نہ صرف ہمیشہ وقت نکال کر رہنمائی کی بلکہ اس مجموعے کی تیاری میں بھی قدم بہ قدم میری سرپرستی کی اور بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔

بعد ازاں اردو کے عہد ساز شاعر اور میرے محسن و مربّی قبلہ ڈاکٹر خورشید رضوی، مشفق و مہربان استاد شاعر جنابِ حلیم قریشی، صاحبِ طرز شاعر و نقاد مخدوم و مکرم جناب خواجہ رضی حیدر، نابغۂ عصر قبلہ ڈاکٹر معین نظامی اور میرے استادِ گرامی قبلہ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کا خصوصی شکریہ، جنھوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میرے بے مایہ لفظوں پہ اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ان بڑوں کی آرا جہاں میرے لیے حوصلہ افزا ہیں، وہیں میرے مستقبل کے لیے امتحان کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ سو مَیں ہمہ وقت خدائے حرف سے ملتجی ہوں کہ وہ مجھے ان بڑے لوگوں کی امیدوں پر پورا اُترنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بھی لازم ہے کہ میری ادبی پرورش شاعری کے دبستانِ اسلام آباد میں ہوئی ہے، سو اِس دبستانِ کے سربراہ مخدوم و مکرم آقائی ڈاکٹر توصیف تبسم کا خصوصی شکریہ بھی مجھ پہ واجب ہے، جنھوں نے کمالِ محبت سے اس مجموعہ کے لیے نام تجویز فرمایا۔

"گوہر گھر کوئٹہ" کی چشم و چراغ، انتہائی مخلص دوست : محترمہ تمثیلؔ حفصہ کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے، جنھوں نے بہت توجّہ اور محبّت کے ساتھ مصوّری کے خوب صورت رنگوں سے کتاب کے سرورق کی آرایش کی۔

اپنے استادِ معنوی بابا جی منیر سیفیؒ کے ایک شعر کے ساتھ کتاب آپ کے حوالے کر رہا ہوں :

رکھ دیا ہے تمھارے چگنے کو
درد کی فاختاؤ! جو بھی ہے

سائل نظامی

کاشانۂ چشتیہ، گوجر خان
یکم اکتوبر ۲۰۱۹

حجرۂ ذات کے طاق پہ دھری غزلیں

سائل نظامی کی شاعری حجرۂ ذات کے طاق سے طلوع ہوتی ہوئی ایک ایسے منظر نامے کی تخلیق کرتی ہے، جو فکر و خیال کے آنگن میں رعنائیِ احساس کی جمالیاتی معنویت کا اشاریہ بھی ہے اور اس کی بصیرت افروز طرزِ نگارش کا اظہاریہ بھی۔ جب وہ غزل سرا ہوا تو اثباتِ وجود سے عرفانِ وجود تک حسنِ اظہار کے کتنے ہی چراغ جل اُٹھے اور یوں اُس کی غزلیں اُس کی داخلی کیفیات اور باطنی واردات کی ترجمان بن گئیں۔ اُس کا حجرۂ جاں خواجگی رنگ کی اُس دل آویز اور پُر کیف جمالیات سے ضیا بار ہے، جس میں کہیں کیسری رنگ کی پھوار پڑتی اور کہیں رنگِ نظام کی بارشِ انوار برستی دکھائی دیتی ہے اور اِس طرح اُس کی غزلیں، جب اس خوش آثار رنگ کا سراپا اوڑھ کر اپنا اظہار کرتی ہیں تو ان غزلوں کے فکری اور معنوی ابعاد میں سلسلۂ چشت کی تہذیب انعکاس پذیر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ رنگ کے تناظر میں، جب رنگ کا طلسماتی گنجینۂ معانی کشید کرتا ہے تو بے رنگی مختلف رنگوں کا سجل اور کومل سا ''چولا'' پہن کر رقص کُناں ہو جاتی ہے۔ رقص کے اِس پس منظر میں سماع کا پیش نامہ اثباتِ یقین کی رعنائیِ خیال کا ایک ایسا منظر تخلیق کرتا ہے، جو کہیں حجرے کے طاق پر رکھے چراغ کی

لَو کو بڑھاوا دیتا ہے اور کہیں جوگیا رنگ کا منظر نامہ خوشبو کے احساس میں ڈھل جاتا ہے۔

رنگ، جو سائل کی غزل کا بنیادی استعارہ ہے، وہ حجرے اور چراغ سے ہم آہنگ ہو کر خانقاہی ماحول کی زندگی آمیز اور زندگی آموز فضا کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یُوں رنگ کی خوش آہنگ تعبیر کا وجدانی شعور : حسنِ خیال کے رنگوں کے تخلیقی الاؤ کو تجلیل عطا کرتا ہے اور اِس طرح اُس کی غزل معاصر شعری منظر نامے میں اپنے معنوی و موضوعاتی کینوس اور فنی و تکنیکی اعتبار سے بالکل الگ اور منفرد وقار کی حامل ٹھہرتی ہے۔

یُوں لگتا ہے جیسے حجرے کی تہذیب سے پھوٹنے والی یہ غزلیں، چراغ کی معنوی تہ داری اور رنگ کی استعاراتی جمالیات کا لبادہ اوڑھ کر، کبھی چُپ کی فضا میں مراقب ہو کر برگ و بار لاتی ہیں اور کبھی ہجر کے لق و دق صحرا میں سفر پیما ہو کر ثمر ور ہوتی ہیں۔ عین، شین، قاف کی گلیم : غزل کی معنوی تہذیب کو ایک ایسے فکری مدار میں گردش کُناں رکھتی ہے، جہاں ایک طرف خارج میں موجود زندگی حصارِ عافیت سے ہم کنار ہو جاتی ہے تو دوسری طرف باطن کے آنگن میں پھیلتے سائے رنگ سے ہم کنار ہو کر ان شعروں میں ڈھل گئے ہیں :

آدمی رنگ کا بنا ہوا ہے
رنگ بھی رنگ کا بنا ہوا ہے
اپنے حُجرے کی اک نشانی کہوں
خواجگی رنگ کا بنا ہوا ہے

ایسے لگتا ہے شام کا سورج
کیسری رنگ کا بنا ہوا ہے

بسنتی رنگ کا چولا پہن کے دیکھ ذرا
فلک پہ ایک رنگیلا ستارہ ملتا ہے

وہ غزلیں، جہاں سائل نے واحد متکلم کے صیغے اور اُس کے فکری تناظر میں اثباتِ وجود کی خوش رنگی کا حصار کھینچا ہے، وہاں زندگی کے مختلف اور متنوع رنگ ایک ایسے رنگ میں منکشف ہوئے ہیں، جن کی تعبیر اپنی ہمہ رنگی اور ہمہ آرائی کے حجرے سے ظہور کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اُس کی غزل میں ''مَیں'' کے آئینے میں نفی کا رنگ بھی ہویدا ہے اور اثبات کا ظہور بھی۔ اِس صیغۂ تکلّم کی انکاری اور اثباتی تجلیات کہیں انکسار اور کہیں عرفان کی تشکیل کرتی ہیں تو سائل کی غزل اپنے تہذیبی اور معنوی ماحول کی جمالیات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اُس کا فکری طرزِ احساس اُس کے انفرادی رنگوں کا ترجمان بھی ہے اور اُس کے مجموعی تہذیبی ماحول کا آئینہ دار بھی۔ اِس انفرادی اور اجتماعی طرزِ اظہار کے جمالیاتی ارتباط سے رنگ و نُور کا ایک ایسا تلازمۂ خیال عکس انداز ہوتا ہے، جس میں سلسلۂ چشتیہ کے صوفیہ سے محبت کا تجربہ اور اس کی بُو باس، اُس کی غزل میں در آتی ہے۔ کبھی اُس کے من میں ''اناساگر'' کا ٹھہراؤ اور سکوت زندگی کا استعارہ بن کر طلوع ہوتا ہے تو اُس کے وجود سے جڑے ہوئے خطے زندگی کا لبادہ پہن لیتے ہیں اور یُوں محسوس ہوتا ہے، گویا ''اناساگر'' کا سکوت زندگی کی گہما گہمی میں ڈھل گیا ہو۔

اِس مجموعے کی جن غزلوں میں، 'مَیں' کا لفظ مختلف ردیفوں میں پھول بن کر کھل اُٹھا ہے، وہاں شاعر کا انفرادی رنگ بھی اُبھر آیا ہے اور اُس کی معنوی جمالیات بھی۔ 'مَیں' کے متنوع معنوی تلازمے: عرفانِ ذات کے مختلف رنگوں کے پس منظر سے جھانکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان رنگوں کی جلوہ پیرائی 'مَیں' کے طرزِ احساس کو نفی اور اثبات کے قرینوں میں متشکل کرتی اور اس کے معانی کی جمالیات کو نئے آہنگ میں آشکار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ 'مَیں' کے پیکر کو سنبھالنا بہ یک وقت بہت مشکل بھی ہوتا ہے اور نہایت آسان بھی۔ مشکل ان معنوں میں کہ 'مَیں' نرگسیّت کے آنگن میں اُتر کر کِبر و اَنا کے طلسم میں ڈھل جاتی ہے اور یہ رویہ کسی صورت میں خوش کُن جذبوں کا عکاس نہیں ہوتا۔ البتہ 'مَیں' کے اظہاریے کی آسان اور خوش آثار معنویت اُس وقت اُجاگر ہو سکتی ہے، جب شاعر کے پیشِ نظر نفی و اثبات کا سارا فکری اور جمالیاتی منظر نامہ منعکس ہو رہا ہو اور اُس کے سامنے خارج اور باطن کے رنگ ہویدا ہوں تو 'مَیں' کی معنویت کے کئی در وا ہو جاتے ہیں:

دیکھ! سہمے ہوئے پرندوں کو
سوچ! کس کس کی جان میں نہیں مَیں

نقش بر خاک تھا، بھٹی سے گزارا گیا میں
الدد عشق کہ صحرا میں اُتارا گیا میں

مجھ سے مانوس ہونے والے، سُن!
کسی دوجے میں مبتلا ہوں میں

آواز نہیں پلٹ کے آتی
لے لے کے وہ نام تھک گیا میں

سائل کی یہ غزلیں سُر تال کے ایک ایسے آہنگ میں گُندھی ہوئی ہیں، جو کہیں رنگ اور کہیں دھمال کھیلتی نظر آتی ہیں۔ ان غزلوں میں لفظوں کے انتخاب، مصرعوں کے فنی اور تکنیکی درو بست اور وزن و آہنگ کی لے کاری میں تیور سُر بھی جڑے ہوئے ہیں اور مدھر سُر بھی۔ کہیں ان کی لَے میں شوخ رنگوں کی آمیزش دکھائی دیتی ہے اور کہیں لفظ کے زیر و بم کو اُس کے فطری آہنگ میں تصویر کرنے کا جتن بھی نظر پڑتا ہے۔ لفظ کا انتخاب: اُس ذہنی اور فکری کیف سے ہم کنار ہے، جو شاعر کے باطن میں موجود ہے اور اُس کے خارج میں بھی۔ اُس نے سلسلۂ چشتیہ کے خانقاہی ماحول میں رچ بس کر دیکھا ہے۔ صرف دیکھا نہیں، بلکہ اسے اپنے باطن کی مختلف کیفیات سے ہم مزاج اور ہم آہنگ بھی کیا ہے اور یُوں اُس کے ہاں غزل کا آہنگ اور اُس کا اظہار وجدانی اسلوب کی نیرنگی میں ڈھل گیا ہے۔

''چراغ درونِ در'' سائل نظامی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اِس مجموعے میں اُس نے غزل گوئی کا ایک ایسا رنگ اُبھارا ہے، جو اُس کے تخلیقی وفور کا آئینہ دار بھی ہے اور اُس کی فنی ریاضت کا گواہ بھی۔ نہ اُس کا مصرعہ شکن آلود ہے، نہ اُس کا شعر پژمردہ، بلکہ اُس کے ہاں مصرعہ

آرائی اور شعر بافی کے آنگن میں ہنروری کے وہ سارے موسم طلوع ہوتے ہیں، جو ایک طرف خارجی رویّوں سے مشک بار ہیں تو دوسری طرف اُس کے باطنی طرزِ احساس سے ضیا بار۔ اُس کی زبان اور اُس کا شعری اظہاریہ: تہذیب اور روایت کا ترجمان بھی ہے اور نئے موسموں اور زمانوں کا سندیسہ بھی۔ اُس کا اسلوب بہت تازہ کار اور شاداب ہے۔ اُس میں تہذیبی رنگ رس کی جلوہ آرائی بھی موجود ہے اور معاصرانہ ماحول کی جلوہ پیمائی بھی۔ فکری اعتبار سے وہ اُس نظامِ مہر سے وابستہ ہے، جہاں خیال کی رعنائی، حسنِ کلام کی تعبیر سے مملو ہو کر ایک نئے اور خوش رنگ جہانِ معنی کی تشکیل کرتی ہے اور اُس جہانِ معنی میں وہ بابِ سخن کُھلتا ہے، جو خیالِ حسن اور حسنِ خیال کی بُو قلمونی اور رنگا رنگی کا اشاریہ ہے۔

مَیں جہانِ سخن میں پیشین گوئی کا قائل نہیں اور اندازے لگانا بھی مناسب خیال نہیں کرتا، لیکن مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اگر شاعر نے اپنا شعری سفر اسی جہت اور سمت میں جاری رکھا اور اپنے تہذیبی اور فکری آدرش سے رُو گرداں نہ ہوا تو وہ دن دور نہیں، جب غزل کا سارا علاقہ اس کی جاگیر میں ہو گا۔

عبدالعزیز ساحرؔ

صدر شعبۂ اردو
علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد
۲۳ اکتوبر ۲۰۱۹

باطنی تجربے کی شاعری

یہ تقریباً آٹھ نو ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک اُڑتا ہوا شعر میری سماعت تک پہنچا اور مَیں اِس شعر کی کیفیت کے ہمراہ بہت دیر تک رہا:

اب مجھے سونا چاہیے سائلؔ
شاید اُس کو بھی نیند آتی ہو

مَیں نے شعر سنانے والے سے دریافت کیا کہ کس کا شعر ہے؟ تو اُس نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اگرچہ شعر میں تخلّص استعمال کیا گیا تھا لیکن یہ تعیّن ہو نہیں سکا یہ ''سائل'' کون ہے؟ یقیناً سائل دہلوی کا تو یہ شعر ہو نہیں سکتا کہ اِس سے جدید لب و لہجہ کی آنچ آرہی تھی۔ پھر مَیں بھول گیا۔ گزشتہ دنوں لاہور حاضری ہوئی تو میرے عزیز دوست اور باکمال شاعر واجدؔ امیر سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے ساتھ تازہ کار شاعروں کا ہجوم ''پاک ٹی ہاؤس'' میں موجود تھا۔ سب ہی جدید لب و لہجہ کے شاعر تھے۔ اِن ہی شعرا کی گونج میں مجھے ایک مرتبہ پھر یہ شعر یاد آگیا اور مَیں نے واجد امیر سے دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ واجد امیر کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھِل گئی اور انھوں نے کہا: ہمارے دوست ''سائل نظامی'' کا ہے، گوجرخان میں رہتے ہیں اور ساتھ ہی

انھوں نے سائل نظامی کے دو چار شعر اور سنا دیے۔ یہ اشعار بھی اپنی ایک الگ فضا رکھتے تھے۔ پھر مَیں کراچی واپس آ گیا۔ واپس کیا آ گیا! میرے ذہن میں سائل نظامی کے شعر کا تاثر بھی کہیں روپوش ہو گیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ چند روز قبل ''سائل نظامی'' کا فون آیا اور انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ ''مَیں سائل نظامی بول رہا ہوں، آپ کا پوسٹل ایڈریس درکار ہے۔ مَیں اپنے شعری مجموعے کا مسوّدہ آپ کو ارسال کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ اُس پر اپنی رائے تحریر کر دیں۔'' مَیں نے کسی تفصیل میں جائے بغیر اُن کو پتا لکھوا دیا اور اب اُن کا مسوّدہ نہ صرف میرے سامنے ہے بلکہ گزشتہ رات سے کئی مرتبہ اس کا مطالعہ کر چکا ہوں اور تعجب یہ ہے کہ سائل نظامی کے اوّلین شعر کو سن کر میرا اُن کے بارے میں جو تاثر قائم ہوا تھا وہ نہ صرف برقرار ہے بلکہ اُن کی شاعری کی دیگر جہتیں بھی مجھ پر واضح ہو چکی ہیں۔ یہ تمام جہتیں اپنی ایک معنوی اکائی رکھتی ہیں لہٰذا موضوعات کے تنوّع کے باوجود لہجہ کی یکسانیت اور اسلوب کی انفرادیّت اپنی جگہ موجود ہے۔ مَیں اپنی گفت گو کی تصدیق کے لیے سائل نظامی کے کچھ اشعار درج کرتا چلوں تا کہ آپ بھی میرے ہم خیال ہو سکیں:

عکس تیرا ہماری آنکھوں میں
دایمی رنگ کا بنا ہُوا ہے

❁

مَیں اپنے سچ پہ تو قایم رہوں گا کم از کم
نبھا سکوں جنھیں، وہ قاعدے بناؤں گا

میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی تُو
تیری تصویر دیکھتا ہُوا مَیں

سب کے سب بکھرے پڑے تھے کسی ملبے کی طرح
شہر سارا کسی بھونچال میں آیا ہُوا تھا

جو دل فریب باتیں تھیں، سب دے گئیں فریب
جو دل گداز لگتے تھے لہجے، نہیں رہے

یہ ہجر راستا ہے اور وصل منزل ہے
ہم ایسے لوگ سدا راستے میں رہتے ہیں

کیا جانیے؟ کب تک مِری آنکھوں سے بہے گا
اِک اشک، جو کل شب تِرے انکار سے جھانکا

سفر ہے سینہ بہ سینہ ہمارے شعروں کا
کسی صحیفۂ نامستند میں تھوڑی ہیں!

ہر شاعر کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ یہ اسلوب براہِ راست شاعر کی شخصیّت سے نہیں بلکہ اُس کے اُس طرزِ اظہار اور طرزِ ترکیب سے وجود میں آتا ہے جس کے حوالے سے وہ اپنے محسوسات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کو کسی معنوی وحدت میں پروتا ہے۔ یہ اسلوب عموماً اکتسابی ہوتا

ہے مگر ریاضت اور مشق سے لاشعوری طور پر شاعر کی فطرتِ ثانیہ بلکہ شاعر کی تخلیق کا چہرہ بن جاتا ہے۔ سائل نظامی کی شاعری اُن کی باطنی نگاہ یعنی تصوّف کی استدلالی قوّت کا ایک گمانی پرتَو دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنا سفرِ شوق، عرفان کی منزل سے آغاز کر کے ایک عالمِ وجد میں طے کر رہے ہیں لہٰذا ایک تہ دار معنویّت اُن کی شاعری کا داخلی جزو ہو گئی ہے۔ اِس نوع کی شاعری میں ابہام اور لایعنیت کا ظہور لازمی ہوتا ہے لیکن اِس نوع کی لایعنیت اکثر معنیٰ کی تفہیم تک رسائی کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے:

ہم فقیر لوگوں کو تم غریب مت سمجھو
پاک و ہند کی دھرتی چشتیوں کا حجرہ ہے

تجھے مانگ لے گا اللہ سے، بڑی چاہ سے
اِسے مانگ لینے کا ڈھنگ ہے، یہ ملنگ ہے

ہفتے بھر میں ایک غزل بھی کافی ہوتی ہے
اپنے اندر کے شاعر کے زندہ رکھنے کو

یہ درس ہی بچّوں کی تباہی کو بہت ہے
تتلی نہ بنے ''ت'' سے تو تلوار بناؤ

تہِ زمین بھی ہریالیاں ہیں کیا کیا کچھ!
کھُلا یہ مجھ پہ ہَرا پیڑ دفن کرتے ہُوئے

ایک ہی اسم مِرے عشق کا قبلہ ٹھہرا
عاشقی منکرِ توحید نہیں ہو سکتی

خاک سے بے وفائی کیسے کرے!
سائلِ چشت، بُوترابی ہے

منسلک نُور سے رہے تا عُمر
اور معروف خاک سے ہُوئے ہم

ایک عالم کو فیض دیتے ہیں
ایک دہلیز پر پڑے ہُوئے ہم

اُس درِ ناز پہ رکھّی ہے جبیں مَیں نے، جہاں
دست گیر آ کے جُھکیں، دست ِنگر کے مانند

سائل نظامی کی شاعری اپنے اظہار میں بھی اور موضوعات کی سطح پر بھی ایک مختلف شاعری ہے۔ ایسی شاعری جو اپنے قاری کو سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ اُسے استفہامیہ لہجے میں قید کرتی ہے اور پھر اپنی تفہیم کا مطالبہ کرتی ہے۔ سائل نظامی وحدت الوجودی شاعر ہیں لہٰذا وہ خود سے باہر خدا کو تلاش کرنے کے قائل نہیں۔ شاید اِسی لیے اُن کے شعری مزاج میں خودشناسی اور خودداری نمایاں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تخلیقی لگن، جس کے سوتے عموماً کسی عشقیہ طرزِ احساس سے

پھوٹتے ہیں، کسی بھی وحدت الوجودی شاعری کو ایک پرت کا نہیں رہنے دیتی اور اُس کے ہاں موضوعات کا تنوّع اِس قدر بسیط ہو جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ شاعر رومان آفرینی میں محصور دکھائی دینے لگتا ہے۔ سائل نظامی کے ہاں بھی جزوی طور پر یہ رومان آفرینی احتیاط کے ساتھ چہرہ نمائی کرتی ہے لیکن یہ جذبے کی اِس قدر گہرائی لیے ہوئے ہے کہ عمومی استفادے کے ذیل میں نہیں آتی۔ اِس کا خمیر ایمائیت سے اُٹھا ہے جو شاعر کے باطنی تخلیقی تجربے کی دَین ہے۔ سائل نظامی کی شاعری جدید تر غزل کی گونج میں اپنا ایک الگ تشخّص قائم کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یقیناً ایسی شاعری کو قبولیّت کی سند تو جلد مِل جاتی ہے لیکن کسی پائے دار تعارف کی منزل میں دیر سے آتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ سائل نظامی جلد یا بہ دیر یہ منزل ضرور پالیں گے۔

خواجہ رضی حیدر

قائدِ اعظم اکیڈمی، کراچی

۱۴ اپریل ۲۰۱۹

عقیدت

به لحنِ داوَد ہم نوا شو به ناله و درد آشنا شو
به بزمِ پیغمبر ایں غزل را زِ عبدِ عاجز نظامؔ بر خواں

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

نعت شریف

اے صبحِ درخشانِ مدینہ! ترے صدقے
اے شامِ سحربانِ مدینہ! ترے صدقے

کیا شہرِ کرم ہے کہ صبا کہتی ہے ہر دم
اے زائر و مہمانِ مدینہ! ترے صدقے

آباد ہُوئی ہے یہ زمیں تیرے تصدّق
اے مطلعِ امکانِ مدینہ! ترے صدقے

شاداب کِیا کتنے ہی صحراؤں کو تُو نے
اے قطرۂ بارانِ مدینہ! ترے صدقے

ہم ایسوں کو ہے آیتِ جاؤُک سے ڈھارس
اے وسعتِ دامانِ مدینہ! ترے صدقے

اے خاکِ رہِ حضرتِ بُوطالبؑ و حسّانؓ!
ہر ایک ثناخوانِ مدینہ ترے صدقے

اے صاحبِ اسرارِ نبی، تُرکِ سیہ فام
ہر سائلِ سلطانِ مدینہ ترے صدقے

نعت شریف

جب اُن کی چشم عنایات ہونے لگتی ہے
ہر ایک رات نئی نعت ہونے لگتی ہے

کبھی جو رنج و محن مجھ کو گھیر لیتے ہیں
نگاہِ سیّدِ سادات ہونے لگتی ہے

دلِ حزیں مِرے قابو ہی میں نہیں رہتا
نبی کے شہر کی جب بات ہونے لگتی ہے

وہ آفتابِ رسالت طلوع ہوتا ہے
مِرے درُون میں جب رات ہونے لگتی ہے

مَیں غیب دان نبی پر درود پڑھتا ہوں
تو شکلِ کشفِ غیابات ہونے لگتی ہے

صدا لگاتا ہوں: سرکار! آ گیا سائلؔ
تو پھر جو لطف کی برسات ہونے لگتی ہے!

بہ حضورِ امامؑ

ہے عصر کا وقت اور تری سجدے میں جبیں ہے، زہراؑ بھی وہیں ہے
شبیرؑ! تُو مقتل میں اکیلا تو نہیں ہے، زہراؑ بھی وہیں ہے

دُنیا میں کہیں بھی نہیں بد عہد کی ہاں بھی، بے سلف کی ماں بھی
قائم ہے ابھی تک جو، شہا! تیری ''نہیں'' ہے، زہراؑ بھی وہیں ہے

ہے کفر، نفاق اور شرارت تِری میراث، اے قاتلِ عباسؑ!
سادات کے خیموں میں تو قرآنِ مبیں ہے، زہراؑ بھی وہیں ہے

یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہر رنج و بلا میں، میدانِ وغا میں
''ماں'' ساتھ ہے گر میرے تو یہ میرا یقیں ہے؛ زہرأ بھی وہیں ہے

محرومِ کرم کیسے رہے سائلِ دربار، وہ ہے بڑی سرکار
مالکؐ بھی وہیں، ساقئ کوثرؑ بھی وہیں ہے، زہرأ بھی وہیں ہے

الوداع[1]

حسینوں کی حسیں نگری!
تِرے زائر کجاوے باندھتے ہیں
تِری روشن درخشاں صبحوں اور شاموں سے
ناخواستہ دُوری کا لمحہ آگیا ہے
قدم لرزیدہ ہیں اور آنکھ نم ہے
زباں پر حرف جیسے جَم گئے ہوں
یہ کیفیّت کبھی پہلے بھی گزری ہے کسی پر
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ۔۔۔!
جیسے آج پھر آدم کو جنّت سے نکالا جا رہا ہے!!!

---

[1] ۱۸اپریل ۲۰۱۷،اجمیر شریف سے واپسی پر

وطن کے لیے

پڑا رہوں مَیں بھلے ہو کے رہ گزار کی خاک
الٰہی مجھ کو بہم ہو اِسی دیار کی خاک

مِری لحد پہ ہوائیں نہ تیز ہوں یا رب!
وطن کی حد سے نہ نکلے مِرے مزار کی خاک

آشوب

ماں! مجھے بھی صورتِ موسیٰ بہا دے نہر میں
قتلِ طفلاں کی منادی ہو چکی ہے شہر میں

نشار ناسکؔ

آخری امید[1]

نبیٔ رحمۃ للعالمیں!
جہاں کو عدل کا، انصاف کا دستور دینے والے
اے عادل نبی!
تری رحمت کی چادر کے تلے
ترے زیرِ نگیں پلتے ہوئے ہم
عدل سے، انصاف سے محروم ہیں شاید
گزشتہ سال بھر سے ہم
مقدر کی عدالت میں قضیّہ لے کے بیٹھے ہیں

---

[1] سانحۂ پشاور کی پہلی برسی پر

شہا!
پیشی پہ پیشی پڑ رہی ہے
تری چشمِ تلطّف کے علاوہ
زمانے میں ہمارے درد کا درماں نہیں کوئی
شہا!
اپنے ظہورِ نُور کے ماہِ مقدس کے تصدّق
پشاور کے
نہتّے، بے سروسامان اور معصوم مظلوموں کے حق میں
فیصلہ کردے۔۔۔!

سقوط

میرے ملک کے حق میں
سولھویں دسمبر کا دن بہت ہی بھاری ہے
چار عشرے پہلے بھی
میرا مُلکِ پاکستان
کچھ حرام خوروں کی
خود غرَض سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا تھا
اور
آج بھی وطن میرا
کچھ حرام زادوں کی دہشتوں کی زَد پر ہے
خاک کی محبت میں خاک ڈھو رہا ہوں مَیں
خون رو رہا ہوں مَیں
سولھوِیں دسمبر کی رات کتنی کالی ہے!
وہ سقوطِ ڈھاکہ تھا
یہ۔۔۔۔ سقوطِ مستقبل!!!

سُرخ دسمبر

وہ گُل بُوٹے
کہ جن کے دم قدم سے مادرِ گیتی کا چہرہ کھِلنے والا تھا
وہ مستقبل کے فوجی، ڈاکٹر، انجینئر، شاعر، محقق اور مفکّر
وہ پاکستان کی ہر ماں کے بیٹے
وہ پاکستان کے بیٹے
سفید آثار موسم میں اُنھی کے خون کی سُرخی در آئی ہے
نہ عشق و درد و ہجر و وصل کی باتیں
نہ یادیں ہیں کسی کے گیسو و رُخسار کی
یہ موسم تو فقط اُن گُل رُخوں کی یاد میں رنگین ہوتا جا رہا ہے
دسمبر۔۔۔۔
اور بھی غمگین ہوتا جا رہا ہے

غزلیات

صد چاک شدہ سینہ و صد پارہ شدہ دل
وِیں بے خبراں جامہ دریدن نہ گزارند
امیر خسروؒ

هجر کے سائبان میں نہیں مَیں
آج اپنے مکان میں نہیں مَیں

آخری سمت بھی نظر میں ہے
حال آں کہ اُڑان میں نہیں مَیں

کیا کسی کی پناہ گاہ میں ہوں!
خیر و شر کے مَیان میں نہیں مَیں

رفتگاں سے مجھے علاقہ ہے
صفِ آیندگان میں نہیں مَیں

ڈھونڈ مٹی کی ٹاس میں مجھ کو
کانچ کے مرتبان میں نہیں مَیں

دیکھ! سہمے ہوئے پرندوں کو
سوچ! کس کس کی جان میں نہیں مَیں

کیا کسی سے کوئی گِلہ کرتا!
اپنے وہم و گمان میں نہیں مَیں

ایک آیت ہُوں سر بہ سر سائلؔ
ہاں! مگر تیری شان میں نہیں مَیں

آدمی رنگ کا بنا ہوا ہے
رنگ بھی رنگ کا بنا ہوا ہے

عکس تیرا ہماری آنکھوں میں
دایمی رنگ کا بنا ہوا ہے

تجھ سوا ایسا کون چہرہ ہے، جو
نُقرئی رنگ کا بنا ہوا ہے

اپنے حجرے کی اِک نشانی کہوں!
خواجگی رنگ کا بنا ہوا ہے

ایسے لگتا ہے شام کا سُورج
کیسری رنگ کا بنا ہوا ہے

ہمچو خسروؒ، تمھارا سائلؔ بھی
ایک ہی رنگ کا بنا ہوا ہے

تعلّقات تو کم کم ہی اِس زمانے سے ہیں
جو پھر بھی زندہ ہیں اب تک، تو اپنے لکھّے سے ہیں

اُنھیں مَیں کیسے بڑا مان لوں قبیلے کا، جو
کسی کی جا پہ ہیں، وہ بھی کسی سہارے سے ہیں

نیا جہاں نہیں، بس ایک گھر بناؤں گا مَیں
مِری طرح مِرے سپنے بھی چھوٹے چھوٹے سے ہیں

مَیں دوستی کے سوا کچھ نہیں کمایا ہے اور
جو چار دوست کمائے ہیں، وہ بھی پُورے سے ہیں

چراغ رکھّا ہُوا ہے درُونِ در میں نے
کہ روشنی کے جو امکاں ہیں، میرے سائے سے ہیں

ہمارا ظرف بتائے گا: خاندانی ہیں ہم
ہمارے حرف بتائیں گے: کس قبیلے سے ہیں؟

تمھارا نام بھی دُشنام بن نہ جائے کہیں
ہمارے ساتھ نہ اُلجھو کہ ہم مدینے سے ہیں

وفا کے باب میں جتنے بھی شعر لکھّے گئے
مِرا یقین ہے: عبّاسؑ کے قصیدے سے ہیں

بنا سمجھے، بنا بولے، سہولت سے جئیں گے
ہمارے دور میں گونگے سہولت سے جئیں گے

ہمارے شہر کی آب و ہوا بتلا رہی ہے
مریں گے لوگ تو پودے سہولت سے جئیں گے

ہماری آخری سانسوں میں تم آؤ گے، گویا
گھڑی بھر موت سے پہلے سہولت سے جئیں گے

انا ساگر[1] سا اِک ٹھہراؤ ہے مَن میں ہمارے
سو ہم سے متّصل خطے سہولت سے جئیں گے

فقط برداشت کرنے کا سلیقہ گر سکھایا
مِری نسبت مِرے بچے سہولت سے جئیں گے

نذارت دے گیا ہے اِک فرشتہ مجھ کو سائلؔ
زمیں پر اب فقط مُردے سہولت سے جئیں گے

---

[1] اجمیر شریف، ہندوستان میں واقع ایک جھیل

کبھی کبھی جو دُعا کا ستارہ ملتا ہے
کسی کی راہ سُجھاتا ستارہ ملتا ہے

خدایا! گردشِ گردوں سے اُس کو رکھ محفوظ
وہ چاند، جس سے ہمارا ستارہ ملتا ہے

تلاش لیتا ہوں اپنے ہی گھر میں اُس کی گلی
کبھی کبھار تو ایسا ستارہ ملتا ہے

کبھی تو رات ستارے شمار کرتے کٹے
کبھی وہاں بھی اکیلا ستارہ ملتا ہے

بسنتی رنگ کا چولا پہن کے دیکھ ذرا
فلک پہ ایک رنگیلا ستارہ ملتا ہے

اپنی تقدیر دیکھتا ہُوا مَیں
کس کی تحریر دیکھتا ہُوا مَیں!

قدرے تاخیر سے یہاں پہنچا
قدرِ تاخیر دیکھتا ہُوا مَیں

میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی تُو
تیری تصویر دیکھتا ہُوا مَیں

ابتدا کی طرف پلٹ آیا
دمِ آخیر دیکھتا ہُوا مَیں

پیشِ تحریر دیکھتے ہُوئے لوگ
پسِ تسطیر دیکھتا ہُوا مَیں

شعرِ تازہ کشید کرتا ہُوں
مشربِ میرؔ دیکھتا ہُوا مَیں

ریل چلنے لگی ہے اور سائلؔ!
دل بہ زنجیر؛ دیکھتا ہُوا مَیں

مرکزہ جب کہ صرف ذاتی ہو
کیسے تخّیل کائناتی ہو!

میری کوشش ہے دِل کی بات کہوں
یہ غزل بھی نہ تجرباتی ہو
ق
چاہے وہ شاعرہ نہ ہو، لیکن
اُس کو اُردو زباں تو آتی ہو

میرا انداز گفت گُو کا ہو
اُس کا لہجہ مشاعراتی ہو

ایک لمحہ کہ سامنے وہ آئے
ایک ساعت کہ معجزاتی ہو

رُوح تک گَل چکی ہے اُس کی، جیسے
پاؤں کے آبلے دِکھاتی ہو!

اجنبی بھی نہیں رہے ہم تم
کس تعلّق کو اب جتاتی ہو؟

پاؤں کِھنچتے ہیں کیوں زمیں کی طرف
کیا خبر، مجھ کو ماں بُلاتی ہو!

اب مجھے سونا چاہیے سائلؔ!
شاید اُس کو بھی نیند آتی ہو

چُوک ہی خشتِ اوّلیں کی تھی
ورنہ مٹی مِری یہیں کی تھی

آج اخبار میں چھَپی ہوئی ہے
بات مَیں نے ترے تئیں کی تھی

میری اِس نکتہ چِیں طبیعت نے
تیری حالت بھی چِیں بہ چِیں کی تھی

چاند تارے رُکوع کرنے لگے
بزم کس بوریا نشیں کی تھی

ذکر اِک زلفِ عنبریں کا تھا
بات اُس چشمِ سُرمگیں کی تھی

شاعری کِن کے ہاتھ لگ گئی ہے!
جنس یہ اور ہی کہیں کی تھی

تِیرہ بختی کا نقشِ اوّل ہیں اَنا کے چراغ
طاقِ نسیاں پہ رکھ دیے جائیں بجھا کے، چراغ

سرخ ماحول میں بھی روشن ہُوں، خدا رکھّے
داد دیں میری استقامت پر خود آ کے چراغ

ماں کی تصویر ایک کونے میں رکھی ہوئی ہے
جلتے رہتے ہیں سارے کمروں میں دُعا کے چراغ

لاکھ طُوفاں لپیٹنا چاہیں، بُجھیں گے نہیں
تا قیامت رہیں گے روشن کربلا کے چراغ

شہرِ لب بستہ قدر کیا جانے بھلا سائلؔ!
سینچے جاتے ہیں خونِ دِل سے سدا، صدا کے چراغ

بن پائے اگر تم سے تو معیار بناؤ
آواز نہیں لفظ کھنک دار بناؤ

جب متن تعارف کے لیے کافی نہیں ہے
پھر چاہیے کئی حاشیہ بردار بناؤ

ہر جنس کا اِک نرخ تو پہلے ہی سے طے ہے
دربار گِرا کر یہاں بازار بناؤ

تا آں کہ مجھے جھوٹ کو سچ ماننا پڑ جائے
شہ سُرخیاں ایسی کوئی دو چار بناؤ

لفظوں سے کرن بافی روایت ہے ہماری
دُنیا کی نظر میں ہمیں غدّار بناؤ

قسطوں میں گِرانا بھی تو ہے تم نے بالآخر
اب ہم کو بناتے ہو تو یک بار بناؤ

یہ درس ہی بچوں کی تباہی کو بہت ہے
تتلی نہ بنے ''ت'' سے تو تلوار بناؤ

کچھ کشٹ اُٹھانا ہی پڑے گا تمھیں سائلؔ!
در کے لیے لازم ہے کہ دِیوار بناؤ

دُنیا اُجلی ہو جائے تو
شیشے جیسی ہو جائے تو

پَت جھڑ پھر سے آ لیتی ہے
کچھ ہریالی ہو جائے تو

گویائی کا اِذن ملے گا
دُنیا بہری ہو جائے تو

کیا ہو گا، تصویر بھی تیری
تیرے جیسی ہو جائے تو؟

شعر میں ڈھلتے ڈھلتے غم کی
ایسی تیسی ہو جائے تو؟

مَیں بھی کسی کا ہو جاؤں گا
تُو بھی کسی کی ہو جائے، تو

ایک محبّت بھی کافی ہے
لیکن دُوجی ہو جائے تو؟

دُنیا کے غم بھی لکھّوں گا
ہجر نویسی ہو جائے تو

رنگ کے رنگ کھُلیں گے تجھ پر
تُو بھی نظامیؔ ہو جائے تو

حالِ درُوں مرضی سے کون بتاتا ہے!
پانی اپنا رستا آپ بناتا ہے

اُس کے عشق میں مجھ ایسا سودائی تھا
شہروں مُلکوں میں جو میرؔ کہاتا ہے

قیس کی حتمی شکل اُسے معلوم نہیں
بچوں کو میری تصویر دِکھاتا ہے

مَیں لاہور میں تم سے ملنے آیا تھا
حالاں کہ اِس شہر میں میرا داتا ہے

ایسی چارہ گری سے مرنا بہتر ہے
گھاؤ نہیں بھر پاتا، دِل بھر آتا ہے

لاشوں کے موسم کی لپیٹ میں کیوں آیا
شہر مِرا بغداد ہے، نَے غرناطہ ہے

پُرانے لفظ برت کر نئے بناؤں گا
جو بن پڑا تو ہرے راستے بناؤں گا

مَیں اپنے سچ پہ تو قایم رہُوں گا کم از کم
نبھا سکوں جنھیں، وہ قاعدے بناؤں گا

کوئی کہانی بھی مرنے نہ دُوں گا جیتے جی
سو اپنے ہاتھ سے کچے گھڑے بناؤں گا

مَیں اپنے گھر کے بُجھے بام و در پہ پنسل سے
تری منڈیر کے جلتے دِیے بناؤں گا

تُو وار کر کے مِری پشت پر، بڑا بنا ہے
مَیں اپنا نام ترے سامنے بناؤں گا

نہیں تھمے گا کبھی میرے پاؤں کا چکّر
مَیں کاغذوں پہ بہت دائرے بناؤں گا

یہ سارا منظرِ ہست ابتدا سے لکھا اگر
کئی خدا ہیں جو بالشتیے بناؤں گا

انا کے بُت ہیں، دُعا کے مجسّمے بھی ہیں
مَیں پہلے توڑوں گا اور دُوسرے بناؤں گا

جن دِنوں وہ دلِ سیّال میں آیا ہوا تھا
ایک ٹھہراؤ مِری چال میں آیا ہوا تھا

مجھ سا بے لَے اُسے کس طرح پہنچتا کہ وہ شخص
ایک سَم، دوسرے جھپ تال میں آیا ہوا تھا

زِیست کے کھیل میں وہ مجھ کو ہَرانے کے لیے
اپنے کردار کی پاتال میں آیا ہوا تھا

سب کے سب بکھرے پڑے تھے کسی ملبے کی طرح
شہر سارا کسی بھونچال میں آیا ہوا تھا

قید کا خوف کُجا، ایک سکوں تھا، یعنی
خود شکاری بھی اُسی جال میں آیا ہوا تھا

جانے کس رنگ میں تھا مَیں کہ تمھارا لاہور
شہ درہ[۱] تک مِرے اقبال میں آیا ہوا تھا

---

۱ مقامی تلفظ

مَیں کسی ایسے کی منّت نہیں کرنے والا
جو مِرے حرف کی عزّت نہیں کرنے والا

مُجھ سوا کوئی بھی ان جھوٹے خداؤں کے حضور
حرفِ انکار کی جراءت نہیں کرنے والا

تج کے صحراؤں کو شہروں کی طرف نکلوں گا
رنگِ کہنہ میں تو وحشت نہیں کرنے والا

عرصۂ ہجر میں اِک عمر گزار آیا ہوں
اب مَیں تم سے بھی محبت نہیں کرنے والا

تجھ پہ تو خیر مِرا حق ہی نہیں ہے لیکن
خود سے مَیں کوئی رعایت نہیں کرنے والا

اِس بھرے شہر میں کوئی بھی ٹھکانہ نہ سہی
ہجر تیرا مجھے بے چھت نہیں کرنے والا

تین پُشتوں سے میاں! سلسلۂ مہرؒ سے ہوں
مَیں کسی شخص سے نفرت نہیں کرنے والا

عشقِ یک طرف یعنی خوابچوں کا حجرہ ہے
کوہ کَن کے ہاتھوں میں آبلوں کا حجرہ ہے

قتل کرنے والوں کو بادشہ بناتے ہیں
میرا شہر بھی یعنی شامیوں کا حجرہ ہے

ایک دشت ہے دِل میں قیس کی سکونت کو
آنکھ کے علاقے میں پانیوں کا حجرہ ہے

پکھی واس لوگوں کا ٹھور کیا، ٹھکانہ کیا؟
جس میں رہ رہے ہو تم دوسروں کا حجرہ ہے

ہم فقیر لوگوں کو تم غریب مت سمجھو
پاک و ہند کی دھرتی چشتیوں کا حجرہ ہے

نفرتوں کے موسم میں عشق گیر رہتے ہیں
ہم سے پوچھ، یہ دُنیا مَن چلوں کا حجرہ ہے

بیاہ دی گئیں دونوں لیکن آج بھی سائلؔ
میرے باپ کے گھر میں بیٹیوں کا حجرہ ہے!

✿

اِک تُو کہ تیرے دل میں وہ جذبے نہیں رہے
اِک ہم کہ تیرے ہجر میں آدھے نہیں رہے

جو دل فریب باتیں تھیں، سب دے گئیں فریب
جو دل گداز لگتے تھے لہجے، نہیں رہے

اِک ہجر تھا، سو آج بھی ہے ہم قدم مِرا
جتنے بھی اور دوست بنائے، نہیں رہے

مجھ سے بچھڑ کے حسن تمھارا اُجڑ گیا
اب بھی ہو خُوب رُو مگر اُتنے نہیں رہے

دریا بہ بطن آنکھیں تھیں، خانہ بہ دوش دل
بے گھر نہیں رہے، کبھی پیاسے نہیں رہے

جو لُٹی کٹی سی پتنگ ہے، یہ ملنگ ہے
کوئی دل میں پھر بھی ترنگ ہے، یہ ملنگ ہے

جو کبھی زباں زدِ عام تھا، مِرا نام تھا
مگر اب جو باعثِ ننگ ہے، یہ ملنگ ہے

کوئی ربط کیا اِسے شاہ سے، کسی کاہ سے!
کہ یہ تعلقوں پہ تفنگ ہے، یہ ملنگ ہے

کوئی ذات کیا، کوئی نام کیا، یہ غلام کیا!
مگر ایک بات دبنگ ہے، یہ ملنگ ہے

یہاں دل سے دل کا ہے رابطہ، نہیں فاصلہ
یہاں کوئی تھل ہے نہ جھنگ ہے، یہ ملنگ ہے

یہ تجھ ایسا شعبدہ باز نئیں، یہ مجاز نئیں
کوئی جامِ مَے ہے نہ بھنگ ہے، یہ ملنگ ہے

تجھے مانگ لے گا اللہ سے، بڑی چاہ سے
اِسے مانگ لینے کا ڈھنگ ہے، یہ ملنگ ہے

وہ منال و مال کا، دام کا، یہ نظامؒ کا
وہ منافق اور کُسنگ ہے، یہ ملنگ ہے

❁

اگرچہ کم ہی کسی رابطے میں رہتے ہیں
کسے خبر کہ ہم اِک دوسرے میں رہتے ہیں

ہمارا متن ترے عشق سے عبارت ہے
خیالِ غیر کسی حاشیے میں رہتے ہیں

یہ ہجر راستا ہے اور وصل منزل ہے
ہم ایسے لوگ سدا راستے میں رہتے ہیں

ہر ایک شخص یہاں کج پسند ملتا تھا
سو ایک عمر سے ہم تخلیے میں رہتے ہیں

عجیب طرفگی ہے، یعنی ہجر رُت میں بھی
تمھارے ساتھ گزارے سمے میں رہتے ہیں

اِک ایسا لمحہ بھی وقتِ وصال آتا ہے
فراق میں بھی اُسی کے نشے میں رہتے ہیں

میانِ عشق و ہوس فرق جانتے ہیں، سو ہم
جو مدّعا ہو، اُسی دائرے میں رہتے ہیں

ترے نقوش کو آنکھوں میں عکس کرنا ہے
اِسی لیے تو تجھے دیکھنے میں رہتے ہیں

وہ بھول جاتے ہیں یک لخت اپنے سائلؔ کو
جو میری سوچ کے ہر زاویے میں رہتے ہیں

کُن کے امکان سے نکل آئے
ہم ترِے دھیان سے نکل آئے

کیا خبر کوئی لمحۂ عشرت
اپنے سامان سے نکل آئے!

ہم تجھے جسم میں تلاش کریں
اور تُو جان سے نکل آئے

منتظر ہیں کہ اِک حنائی ہاتھ
کسی دالان سے نکل آئے

تیرا ہم چہرہ کوئی چہرہ نہ تھا
ہم بھی ناران سے نکل آئے

کچھ برہُوں کے گیت ، اِک خط کا ٹکڑا رکھنے کو
حجرۂ دِل میں جگہ بنائی دُنیا رکھنے کو

ایک سو بیس دِنوں میں جا کر مُجھ پر بھید کھُلا
خود کو رکھ سکتا ہُوں مَیں بھی تنہا، رکھنے کو!

اب بھی رات گئے مَیں شِو کو پڑھ کر سوتا ہُوں
ایک کتاب ہے تیری یادیں تازہ رکھنے کو

قیمتی شَے ہے، اِس لیے پردے میں رکھّا، ورنہ
تیرا نام بھی لا سکتا ہُوں قافیہ رکھنے کو

عشق اور شعر کے میدانوں میں قیس اور مِیر کے بعد
اکثر ڈھونگی آئے، اُلّو سیدھا رکھنے کو

ہفتے بھر میں ایک غزل بھی کافی ہوتی ہے
اپنے اندر کے شاعر کے زِندہ رکھنے کو

سائلؔ ایسے پیادوں کا یہ چلن پُرانا ہے
خود میں سمٹ کر چلتے ہیں یہ رَستہ رکھنے کو

بیعتِ عشق میں تجدید نہیں ہو سکتی
یاں پس و پیشِ اسانید نہیں ہو سکتی

مَیں نہ لکھوں گا کوئی نام ترے نام سے قبل
مصرعۂ عشق میں تعقید نہیں ہو سکتی

خمِ ابرو کا ہلال اور نہ امیدِ وصال
ایسے عالم میں مِری عید نہیں ہو سکتی

تم بھی اِک دھُن میں مگن، مَیں بھی انا کا قیدی
ایسے میں عشق کی تمہید نہیں ہو سکتی

ایک ہی اِسم مِرے عشق کا قبلہ ٹھہرا
عاشقی منکرِ توحید نہیں ہو سکتی

میرؔ سی شُستہ زباں، داغؔ سا لہجہ سیکھو!
یُوں مِرے شعر پہ تنقید نہیں ہو سکتی

یہ کلیسا نہیں، صحرائے جنوں ہے سائلؔ!
یاں کسی شخص کی تقلید نہیں ہو سکتی

ظرف بھر بارگہِ عشق سے پایا ہُوا ہجر
ہائے یہ ہجر مِری جان کو آیا ہُوا ہجر

کیا لُبھائے گا بھلا ہجر پرستی کو مِری!
قیس و فرہاد کے تَرکے سے بچایا ہُوا ہجر

جل ہی جاتا مَیں تِرے لمس کی حدّت کے سبب
وصل کے دشت میں سر پر مِرے سایا ہُوا ہجر

لوگ تو دفترِ اعمال لیے بیٹھے ہوں
اور سر پر ہو وہاں مَیں نے اُٹھایا ہُوا: ہجر

کتنی دولت ہے، اگر دل میں سمو لی جائے
درِ دُر بار سے سائلؔ پہ لُٹایا ہُوا ہجر

نقش بر خاک تھا، بھٹّی سے گزارا گیا مَیں
المدد عشق! کہ صحرا میں اُتارا گیا مَیں

تیری پیشانی کو اِس خوف سے چھُوتا نہیں ہُوں
خاک روئے گی، اگر بن کے ستارا گیا مَیں

تیرے لہجے سے شناسا ہُوں، مگر جانِ سخن!
تیرے لفظوں کے پس و پیش میں مارا گیا مَیں

سوچتا ہُوں کہ بھلا کیسے مدینہ چھوڑوں؟
امتحاں سخت ہے، کُوفے سے پُکارا گیا مَیں

مَر گیا مَیں تو کھلا بھید یہ مجھ پر سائلؔ!
کیا گزاری ہے کہ ہر آن گزارا گیا مَیں

دُور و نزدیک سے بدلتے رہے
آنکھ کے ذائقے بدلتے رہے

عشق والوں کے وصل کی تھی گھڑی
عقل والے گھڑے بدلتے رہے

تجھ پہ موقوف ہونے والے لوگ
عمر بھر قافیے بدلتے رہے

تیرے در سے اُٹھایا جاتا رہا
خُلد کے فاصلے بدلتے رہے

ایک ساعت میں جینا چاہتا تھا
پے بہ پے ثانیے بدلتے رہے

جن پہ دل کو یقین تھا سائلؔ!
دیکھتے دیکھتے بدلتے رہے

دیدار کو جو مَیں پسِ دیوار سے جھانکا
اِک حُسنِ دل آویز پھر اُس پار سے جھانکا

کیا خطِّ محبّت سے لگی بیٹھی ہے تُو بھی؟
کیوں وصل کا امکاں ترے اِس تار سے جھانکا

خوابیدہ جزیرے میں مِرا سر، تِری چوکھٹ
اِک خواب تھا جو دیدۂ بیدار سے جھانکا

کیا جانیے؛ کب تک مِری آنکھوں سے بہے گا!
اِک اشک، جو کل شب ترے انکار سے جھانکا

تاریکیِ شب سے نکل آیا تھا مَیں اُس دم
جب چہرہ تِرا صبح کے اخبار سے جھانکا

اِک غزل رُخ کی مِرے دل میں کسک ہے، حق ہے
شعر گوئی کی طرف یہ جو لپک ہے، حق ہے

میرے تحریر شُدہ سارے دلائل ہیں غلط
اُس کی جانب سے جو اِک سادہ ورَق ہے، حق ہے

زِیست کرنا بھی کہاں سہل ہے تنہائی میں!
اور مُجھ ایسے کو مَرنا بھی ادَق ہے، حق ہے

راہِ دُشوارِ غزل گوئی میں، اے جانِ غزل!
تیری دُشنام طرازی بھی کمَک ہے، حق ہے

اُس نے تفویض کِیا ہے، کوئی کیا چھینے گا؟
اُس کی یادوں پہ مِرا جتنا بھی حق ہے: حق ہے!

اِک دقیقہ جو یہ خرابی ہے
مسئلہ سارا دست یابی ہے

میرے حجرے میں آ کے بیٹھ رہے
جو کوئی قیس کا صحابی ہے

یاد آتی ہے کس پری وَش کی!
موسمِ چشم آج آبی ہے

عشق واجب ہے اے سخن مستو!
شعر کہنا تو انتخابی ہے

خاک سے بے وفائی کیسے کرے؟
سائلِ چشت بُوترابی ہے

آج یُوں خود سے آ مِلا ہوں مَیں
جیسے رستا بھُلا چکا ہوں مَیں

مجھ سے مانوس ہونے والے، سُن!
کسی دُوجے میں مُبتلا ہوں مَیں

اب کوئی ماسِوا بھی لازم ہے
کب تلک صرف خود کو چاہوں مَیں؟

کون حیرت کدے میں ہے اب کے؟
ایک سایا مِرا ہے یا ہوں مَیں

راستا دیکھنا ہے کام مِرا
سو تِری راہ دیکھتا ہوں مَیں

مجھ کو سائلؔ سمجھ، بھکاری نہیں
ممتحن ہوں سو پوچھتا ہوں مَیں

جہانِ رنگ و بُو ٹھہرا ہُوا ہے
سرائے جاں میں تُو ٹھہرا ہُوا ہے

رواں ہے یاد اُس بیداد گَر کی
رگوں میں اب لہو ٹھہرا ہُوا ہے

مَیں قبضہ پانیوں سے چھوڑتا ہوں
اِسی بَن میں عدُو ٹھہرا ہُوا ہے

دو آبہ بہ رہا ہے آنسوؤں کا
مگر میرا نمو ٹھہرا ہُوا ہے

کہِیں سے نُور کی تنزیل ہو جائے
اندھیرا چار سُو ٹھہرا ہُوا ہے

اُس نے جھانکا ہے آج چلمن سے
وہ جو شرمیلی تھی لڑکپن سے

اُس سراپا پہ شعر کہنے ہیں
قافیے ڈھونڈتا ہوں احسن سے

نقش اُس کے تراشتا سورج
نکل آیا ہے شب کے آنگن سے

رقص میں گھومتی ہے یہ دُنیا
اُس کی پازیب کی چھناچھن سے

اُسے دیکھا تو ہو گئی صادر
بات ایمان کی برہمن سے

کون جانے کہ ہجر کیا شے ہے
اِس کی تو پُوچھیے مِرے مَن سے

مَیں سخن کا بنانے والا ہوں
میری بنتی نہیں سخن کَن سے

کون دیوانِ میر پڑھتا ہے؟
نُور اُٹھتا ہے اِس نشیمن سے

بزمِ یاراں میں فرد ہے سائلؔ
اِسی اُجلے، کَھرے، نئے پَن سے

دشت کی خاک پھانکتے ہُوئے ہم
صحبتِ قَیس میں بڑے ہُوئے ہم

کیسا جاں خیز تھا وہ لمحۂ وصل!
مَر گئے جس کو ڈھونڈتے ہُوئے ہم

منسلک نُور سے رہے تا عُمر
اور معروف خاک سے ہُوئے ہم

گرد آمیز ہو گئے شاید
صفحۂ زِیست پر لکھے ہُوئے ہم

آتش و خُوں سے پا رہے ہیں نمود
وقت کے چاک پر دَھرے ہُوئے ہم

سو رہیں چَین سے کبھی تہِ خاک
سال ہا سال کے جگے ہُوئے ہم

ایک عالَم کو فیض دیتے ہیں
ایک دہلیز پر پڑے ہُوئے ہم

اگر سوچو تو ہے اعجاز میرا
نہیں کوئی بھی ہم آواز میرا

ابھی مشکل تو ہو گی ماننے میں
ابھی ہے بولنا آغاز میرا

الا یا ایہا السّاقی! حذر کر
یہاں کوئی نہیں ہم راز میرا

ابھی ہے لشکرِ اعدا میں لیکن
وہی ہے حاشیہ پرداز میرا

بہت مایوس کُن واقع ہوئے ہیں
ترا انجام اور آغاز میرا

سکوت ٹُوٹ گیا آہِ سرد بھرتے ہُوئے
غزل عطا ہُوئی اُس شہر سے گزرتے ہُوئے

تہِ زمین بھی ہریالیاں ہیں کیا کیا کچھ!
کھُلا یہ مجھ پہ ہَرا پیڑ دَفن کرتے ہُوئے

نئے غموں کی شروعات ہونے والی ہیں
مَیں لڑکھڑانے لگا سیڑھیاں اُترتے ہُوئے

کبھی تو عرصۂ وحشت میں ایسا لگتا ہے
کہ بس خیال ہیں ہم بھی کسی کے بَرتے ہُوئے

مَیں ہم کنار تھا، جب اُس کی بات سُنتا رہا
سو بے کنار ہُوا اپنی بات کرتے ہُوئے

مَیں سُوکھتا گیا پھُولوں کی قحط سالی میں
خود اپنے خُون سے تتلی کا پیٹ بھرتے ہُوئے

اِس اِک سبب سے شہر میں شہرت نہیں ملی
اپنی یہاں کسی سے طبیعت نہیں ملی

صحرا اُتھل پُتھل کے نظارا کیے، مگر
بڑھ کر مِرے مکان سے وحشت نہیں ملی

لبّیک کہہ کے عشق سے انکار کیوں کروں؟
روہی کے پِیر سے مجھے یہ مَت نہیں ملی

پلکوں کے لفّ و نشر نے ایسے دیے جواب
مجھ کو سوال کرنے کی مہلت نہیں ملی

بازارِ حُسنِ شعر میں گرمی تو تھی، مگر
مجھ کو مِرے شعور کی قیمت نہیں ملی

بابوں کے پاس بیٹھ کے سیکھی ہے شاعری
میرے معاصرین کو یہ چھت نہیں ملی

چیزیں تو ناشتے میں ہیں سائلؔ وہی، پہ آج
مکھن میں ماں کے ہاتھ کی لذّت نہیں ملی

جو ہم رہی میں ہیں، میری سند میں تھوڑی ہیں؟
کَنارِ قبر تلک ہیں، لحد میں تھوڑی ہیں؟

یہ خوشہ چِیں، تِرے منصب پہ مرنے والے لوگ
یہ اہتمام وفاؤں کی مَد میں تھوڑی ہیں؟

تماشا دیکھنے آئے ہیں میرے ڈُوبنے کا
یہ لوگ بر لبِ دریا مدد میں تھوڑی ہیں؟

کسی کے ساتھ میں ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے
کہ ہم تمھاری طرح ردّ و کَد میں تھوڑی ہیں؟

محبّتوں کے پُجاری ہیں یہ، مداری نہیں
یہ لوگ خواہشِ داد و سِتَد میں تھوڑی ہیں؟

سفر ہے سینہ بہ سینہ ہمارے شعروں کا
کسی صحیفۂ نامستند میں تھوڑی ہیں؟

دیارِ عشق کی نیرنگیاں ہیں یہ سائلؔ!
وگرنہ رنگ یہ دشتِ خرد میں تھوڑی ہیں؟

گدا: فقیر، فقیر: ابتلا بنے ہوئے ہیں
ہمارے شہر کے معیّار کیا بنے ہوئے ہیں!

ملیں جو حضرتِ یوسفؑ تو مَیں بتاؤں اُنھیں
کہ میرے یار بھی میرے بھرا[۱] بنے ہوئے ہیں

کہیں کہیں مِرے چہرے پہ تاب ناکی ہے
کہاں کہاں مِرے اندر خلا بنے ہوئے ہیں!

---

۱ بھائی

یہ کوئی روگ نہیں، ہم نے جوگ پالا ہے
کہ سانولے نہ رہے، جوگیا بنے ہوئے ہیں

جو تُو نے چاہا، جو تُو نے کہا، کِیا ہم نے
جو تُو نے چاہا، جو تُو نے کہا، بنے ہوئے ہیں

ہر اِک قدم پہ یہ غم ہائے نَو بہ نَو سائلؔ!
تری دعا سے بہت آشنا بنے ہوئے ہیں

وہ، جن کی ذَیل میں یہ زائچے بنے ہُوئے ہیں
سبھی ستارے مِرے سامنے بنے ہُوئے ہیں

مُجھی پہ ہجر اُتارا گیا تھا پہلے پہل
یہ قیس وَیس مجھے دیکھ کے بنے ہُوئے ہیں

مِری شبوں کو کسی خواب سے علاقہ نہیں
مِرے لیے تو فقط رَت جگے بنے ہُوئے ہیں

پڑے گا وقت تو یہ بھی نظر نہ آئیں گے
جو تین، چار مِرے لاڈلے بنے ہُوئے ہیں

مَیں اِس لیے بھی شناسا ہُوں سب خداؤں سے
کہ بیش تَر تو مِرے ہاتھ کے بنے ہُوئے ہیں

سخن کے باب میں خورشید[1] کا مقلّد ہُوں
مِرے لیے تو سبھی راستے بنے ہُوئے ہیں

---

[1] ڈاکٹر خورشید رضوی

اُس کی یاد آئی ہے اِک مصرعۂ تَر کے مانند
دُھن رہا ہُوں مَیں دلِ زار کو سَر کے مانند

اُس درِ ناز پہ رکھی ہے جبیں مَیں نے، جہاں
دست گیر آ کے جُھکیں دستِ نگر کے مانند

کوئی اِس دشت سے آگے کا پتا دے مُجھ کو
وہی بے چینی ہے یاں بھی مِرے گھر کے مانند

روح آباد ہے اِک شہرِ خموشاں کی طرح
اور بدن چیختا رہتا ہے کھنڈر کے مانند

''سوختم سوختم از آتشِ ہجراں ہیہات''[۱]
ایک اِک شعر نکلتا ہے شرر کے مانند

نقب زَن جو بھی ہُوا، اُس سے لڑائی ہے مِری
اِس دبستاں کو سمجھتا ہُوں مَیں گھر کے مانند

ہے عجب طُرفہ تماشا یہ سزا بھی سائلؔ!
اپنے گھر میں ہُوں، مگر شہر بدَر کے مانند

---

[۱] مصرعہ: فقیر اوگھٹ شاہ وارثیؒ

خوشی کے پہلو بھی صدمات سے نکلتے ہیں
تمام رَستے مِرے ہاتھ سے نکلتے ہیں

دِیے نے چھوڑ دیا ٹمٹمانا آخرِ شب
سو ہم بھی مجبسِ حالات سے نکلتے ہیں

پڑے رہیں گے ترے در پہ تا دمِ آخر
ہم ایسے لوگ کب اوقات سے نکلتے ہیں؟

ہم اہلِ عشق رہِ حُرّیت کے راہی ہیں
سو ہم بھی خیمۂ سادات سے نکلتے ہیں

نہیں نہیں؛ مِرے احباب میں نہیں کوئی
جو کم نظر ہیں، مِرے ساتھ سے نکلتے ہیں

کسی کے وصل کی خواہش میں دِل دِیا تُم کو
ہمارے کام بھی خیرات سے نکلتے ہیں

مَیں ہم رکابِ مجنوں میں دشت چھانتا ہُوں
پَہ میرے عکس تو باغات سے نکلتے ہیں

سواب کے زِیست بسر کر سکیں گے چَین کے ساتھ
تِرے بدن کی حوالات سے نکلتے ہیں

کہاں یہ دولتِ گریہ یونہی لُٹائی گئی؟
غزل سنانی تھی جس کو، اُسے سنائی گئی

وہ بات، جس کے لیے مِل رہے تھے برسوں بعد
وہ بات ہو گئی باتوں میں پھر سے؛ آئی گئی

یہ عشق مندی کا منصب عجیب منصب ہے
خدا وجود میں دَر آیا اور خدائی گئی

کَٹی ہے عمر مگر در نہیں بنا پائے
فصیل کتنی سہولت کے ساتھ اُٹھائی گئی

گزشتہ رات مِرے خواب کا لہو کر کے
بطونِ چشم میں تعبیر بھی دبائی گئی

صداقتیں ہیں فقط پیش خیمہ ہجرت کا
نصاب میں ہمیں ہر شَے غلط پڑھائی گئی

اپنی ہی راہ میں حائل بھی تو ہو سکتے ہیں
ہم خود اِس جنگ میں زائل بھی تو ہو سکتے ہیں

بحث کرنے میں قباحت تو نہیں ہے، لیکن
اب مِرے پاس دلائل بھی تو ہو سکتے ہیں

جھگڑا کرتے ہوئے اِتنا بھی نہ سوچا اُس نے
ہم کسی بات سے گھائل بھی تو ہو سکتے ہیں

ڈھلتی عُمروں میں جنھیں لوگ سُنا کرتے ہوں
میرے نغماتِ اوائل بھی تو ہو سکتے ہیں

ہم سے بوسیدہ بدن، مَیلے لباسوں والے
شہرِ نیرنگ کے سائلؔ بھی تو ہو سکتے ہیں

❁

اہلِ منصب ہوں، سبک ساری نہیں کر سکتا
شعر سُن لیجے، اداکاری نہیں کر سکتا

کچھ بھی کر سکتا ہوں، لیکن مَیں بہ نامِ جدّت
میر و اقبال سے غدّاری نہیں کر سکتا

شاعری کارِ مشقّت ہے، سوا اِس سے انصاف
دال اور دَلیے کا بیوپاری نہیں کر سکتا

جس طرح بولتا ہے تیرا دِوانہ سرِ بزم
بات یُوں کوئی بھی درباری نہیں کر سکتا

تیرے سائلؔ کے سِوا دشتِ سخن میں کوئی
ہَرے لفظوں کی شجرکاری نہیں کر سکتا

خلا میں ایک ستارہ تلاش کر رہا تھا
مَیں اپنا گُم شدہ لمحہ تلاش کر رہا تھا

تری گلی سے مجھے مل گیا ہے سر اپنا
مَیں چند روز سے کاسہ تلاش کر رہا تھا

مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ
مخاطبت کا بہانہ تلاش کر رہا تھا

تم آ گئے ہو، بڑی عُمر ہے تمھاری کہ مَیں
ابھی ابھی تمھیں گویا تلاش کر رہا تھا

تمھارا خط نظر آیا تو پڑھنے بیٹھ گیا
وگرنہ مَیں، مِرا بٹوہ تلاش کر رہا تھا

✿

بے نیلِ مرام تھک گیا مَیں
اے ہجر کی شام! تھک گیا مَیں

آواز نہیں پلٹ کے آتی
لے لے کے وہ نام تھک گیا مَیں

کچھ کچھ بھی نہیں کھُلا ہُوں خود پر
اے سعیِ تمام! تھک گیا مَیں

تُو بھی تو نہیں ہے ساتھ میرے
اے میرے امام! تھک گیا مَیں

پیروں میں وہ دائرے تھے سائلؔ
دورانِ قیام تھک گیا مَیں

ایک ترتیب سے پڑے ہُوئے تھے
پاؤں میں راستے پڑے ہُوئے تھے

دن سفر میں گزرتا جاتا تھا
بعد ازاں رَت جگے پڑے ہوئے تھے

بے نمک وصل کیسے سہہ پاتا!
جیبھ میں ذائقے پڑے ہُوئے تھے

ایک خط سر بہ مُہر تھا مِرے پاس
اور کچھ تو کھُلے پڑے ہُوئے تھے

ق

لامحالہ بِچھڑنا بَنتا تھا
درمیاں فاصلے پڑے ہُوئے تھے

اور پھر اِس معاملے کے بیچ
دو گھروں کے بڑے پڑے ہُوئے تھے

کچھ تو مے خوار بھی تھے محفل میں
اور کچھ بِن پیے پڑے ہُوئے تھے

شجر نہیں ہوں مگر اپنے سائے رکھتا ہوں
مَیں سر پہ بہنوں کے چھتری بنائے رکھتا ہوں

مِرے مراجِع افکار پوچھنے والو
مِرا دماغ ہے، مَیں اپنی رائے رکھتا ہوں

جہاں پہ خواب فرشتوں کی شکل اُترتے ہیں
مَیں اپنی ذات میں وہ خوابنائے رکھتا ہوں

کوئی کوئی مِرے معیّار پر اُترتا ہے
کسی کسی ہی سے مَیں ہیلو ہائے رکھتا ہوں

سو مجھ کو ابلۂ تہذیب ہی سمجھیے کہ مَیں
بڑوں کے سامنے گردن جھُکائے رکھتا ہوں

تیری شاہی میں کیا بچا ہے مجھے!
تخت بھی جیسے بوریا ہے مجھے

مَیں بھی نوحہ ہوں تیرے ماضی کا
تُو نے دِیوار پر لکھا ہے مجھے

اور تو بس میں بھی تِرے کیا تھا!
تُو نے انکار کر دیا ہے مجھے

وہ رچاوٹ ہے تیرے لہجے میں
کَن رَسی بھی معانقہ ہے مجھے

آئنہ بار بار کیا دیکھوں!
ایک ہی شخص دیکھتا ہے مجھے

اب وہ عالَم ہے لاوجودی کا
اپنا ہونا بھی کھَل رہا ہے مجھے

سبھی درون و بروں، کلُّ مَن علیہا فان
ترا بدن، مِرا خوں، کلُّ مَن علیہا فان

جو اِذن ہو تو زمیں پر اُتار لوں تجھ کو
جو اِذن ہو تو کہوں! کلُّ مَن علیہا فان

فنا کی زَد پہ ہے یہ تیری تاج داری اور
مِرا بھی حالِ زبوں، کلُّ مَن علیہا فان

تُو بے قرار تھا، سو ہے، نئی مچان پہ بھی
مَیں مطمئن تھا، سو ہوں، کلُّ مَن علیہا فان

یہ تیرے تحفے، تصاویر اور خوش بُوئیں
کہاں چھپا کے رکھوں، کلُّ مَن علیہا فان

قصد باندھا ہے جب سے ہجرت کا
کیف آنے لگا سکونت کا

پیڑ سے کس طرح کلام کروں؟
میرا منصب نہیں نبوّت کا

وہ بھی اِک نام کے سبب سے ہُوں
مَیں جو حافظ ہُوں ایک آیت کا

سر پہ کوئی نہیں ہے دونوں کے
ایک سا غم ہے یہ، مِرا، چھت کا

قیس کی جانشینی چھوڑ آیا
حوصلہ ہی کہاں تھا وحشت کا!

نیند آنے لگی ہے تجھ کو بھی
مَیں بھی جاگا ہُوا ہُوں مدّت کا

یہ ابھی شاعری نہیں سائلؔ
یہ تو اِک نقش ہے ریاضت کا

بوجھ یاروں کا بھی اِس درجہ اُٹھانا پڑا تھا
تاج ہر ایک مجھے سر سے ہٹانا پڑا تھا

بزم میں دیر سے پہنچا ہوں کہ مجنوں کے لیے
پئے اِمداد، مجھے دشت میں جانا پڑا تھا

تُو ہی تو ہے کہ جسے دِل میں جگہ دے دی ہے
ورنہ قدموں میں مِرے سارا زمانہ پڑا تھا

عشق آباد میں تھا قیس کے جیسا مَیں بھی
اُس کا مجنوں، تو مِرا نام دِوانہ پڑا تھا

سائلِ چشت نگر کب تھا کسی کے بس میں؟
وہ تو یُوں کہیے کہ بس رنگ سنانا پڑا تھا

۲۰۰۶

زمانہ بولتا ہے اور مَیں چُپ
ستم کا سلسلہ ہے اور مَیں چُپ

نہیں اب کوئی رسم و راہ تجھ سے
یہ اُس کا فیصلہ ہے اور مَیں چُپ

غموں میں تو خموشی تھی، مگر اب
خوشی کی انتہا ہے اور مَیں چُپ

عجب پتھر سا ہوتا جا رہا ہُوں
کہ کوئی چل بسا ہے اور مَیں چُپ

کہو! کیسے کٹے ہیں دن، مِرے بِن؟
وہ مُجھ سے پُوچھتا ہے اور مَیں چُپ

وہ چُپ تھا اور مَیں روتا تھا پہلے
اور اب وہ رو پڑا ہے اور مَیں چُپ

۲۰۰۸

جس کو کہتے ہیں : فقیروں کی جناں ہے، یاں ہے
یار کے چہرے سے ہی ذات عیاں ہے، یاں ہے

میری محفل میں خوشا درد کی دولت رکھ دی
ساری دُنیا کا کوئی سوختہ جاں ہے، یاں ہے

واں مِرے یار کی محفل میں ہیں شہنائی کے سُر
اور جو درد و غم و اندوہ و فغاں ہے، یاں ہے

دو کَمانوں سی ہی قربت تھی، مگر وقت کا کھیل
اب فقط ایک ہی بوسیدہ کَماں ہے، یاں ہے

ایک دِن تم بھی دِوانوں کی طرح پُوچھو گے
میرا اِک یار تھا سائلؔ، وہ کہاں ہے! یاں ہے؟

۲۰۰۹

پیرِ مغاں کی مجھ کو دُعا : عین، شین، قاف
دُنیا کو کیا خبر کہ ہے کیا : عین، شین، قاف!

اے دوست! اِس جہاں میں ہمیں تو ملا نہیں
ہر ایک لب پہ گو ہے سجا : عین، شین، قاف

مجھ کو منازلِ بشریّت سُجھائی دیں
جس دِن سے وِرد مَیں نے کِیا : عین، شین، قاف

باقی رکھے گا تجھ کو یہی دو جہان میں
ظاہر میں گو ہے راہِ فنا : عین، شین، قاف

اِس ریگ زارِ زِیست میں سائلؔ تمام عُمر
کُندن ہُوا بدن تو ملا : عین، شین، قاف

۲۰۱۰

غزل کی ابتدا ہوئی کوئی چراغ بجھ گیا
مَیں لکھ رہا تھا روشنی کوئی چراغ بجھ گیا

وہ فیض پا لیا تھا مَیں نے اعتکافِ ہجر سے
ہَوائے وصل جل مَری کوئی چراغ بجھ گیا

مِرے شعور میں نہ تھا، مجھے شعور بھی نہ تھا
وہ عشق تھا کہ دوستی؛ کوئی چراغ بجھ گیا

ہر اِک گھڑی نئی بلا، ہر اِک مدینہ : نینوا
ابھی ابھی خبر ملی کوئی چراغ بجھ گیا

مثالِ بادِ تُند تھا وہ اپنی دُھن میں چل دیا
اُسے خبر نہ ہو سکی کوئی چراغ بجھ گیا

۲۰۱۰



سائل نظامی اِس زمانے میں ہے مگر اس زمانے کا آدمی نہیں : ع

اپنے گھر میں ہوں مگر شہر بدر کے مانند

اُس کے احساسات و مشاہدات بھی کسی اور زمانے کے خواب سے عبارت ہیں جو ماضی اور مستقبل دونوں میں پھیلا ہوا ہے۔ سائل نظامی کی غزل ایک وفور اور سرمستی سے چھلکتی ہے۔ ''دشتِ خرد'' سے دُور ''خوابچوں کے حجرے'' میں ''دیارِ عشق کی نیرنگیاں'' دیکھتے ہوئے وہ انوکھی تمثالیں تخلیق کرتا ہے۔ اُس کے ہاں آپ کو کہیں ''پلکوں کا لف و نشر'' ملے گا اور کہیں ''دلِ زار کو سر کے مانند دُھننے کی دُھن''۔

''چراغ درونِ دَر'' سوزِ دروں کی علامت ہے جس کی تپش سے روایتی لفظ پگھل کر معنیٔ تازہ میں ڈھلتے ہیں اور یہی سائل کا مسلکِ فن ہے :

پُرانے لفظ برت کر نئے بناؤں گا ۔۔۔ جو بن پڑا تو ہرے راستے بناؤں گا

مَیں سائل نظامی کے اوّلین مجموعے کی پذیرائی کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں۔

خورشید رضوی، لاہور

۱۹ اپریل ۲۰۱۹

Price: Rs. 300

9 789697 829040

قلم دوست مطبوعات

میلاد چوک، وارڈ نمبر 7، حیات سر روڈ، گوجر خان

Cell: 0300-9833334, 0300-5921192

Email: qalam.dost6@gmail.com